بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جمہوریت، مسلم دنیا اور تحریکِ اسلامی

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

پاکستان اور مسلم ممالک کم از کم گذشتہ ۲۵ سال سے ایک ایسے سیاسی خلفشار، عدم استحکام اور سیاسی بازی گری کا شکار ہیں، جس نے نہ صرف عوام بلکہ باشعور اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بھی جمہوریت پر اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے اور عموماً یہ بات کہی جارہی ہے کہ: 'ایسی جمہوریت سے تو بادشاہت اور فوجی آمریت ہی بہتر ہیں'۔ اس مفروضے کو مستحکم کرنے کے لیے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ: 'عام طور پر فوجی آمریت کے دور میں ملک کی معیشت میں ترقی ہوئی ہے، اس لیے جمہوریت کو خیرباد کہہ کر ہمیں صدارتی یا آمرانہ نظام کو اختیار کرنا چاہیے'۔ اس کیفیت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ جمہوریت سے محبت کے تعلق سے قطع نظر اور جمہوری اَدوار کی بدعنوانیوں، ظلم اور ناانصافی، طبقاتی تناؤ اور تفاوت کو کچھ دیر کے لیے ذہن سے محو کرتے ہوئے معروضی طور پر یہ جائزہ لیا جائے کہ خرابی کی جڑ کہاں ہے؟ کیا واقعی مسلم ممالک اپنی تاریخی روایات کے تناظر میں جمہوریت کے لیے ناموزوں اور بادشاہت یا آمریت کی روح اور نظام سے قریب تر ہیں؟ اور کیا واقعی ان کی نجات صرف مغربی جمہوریت میں ہے؟ اس آخری بات کو خاص طور پر تیونس کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

● **مغربی جمہوریت**: جس نظام کو مسلم دنیا میں 'مغربی جمہوریت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ باقیات ہیں اس مغربی سامراجی نوآبادیاتی نظام کے ورثے کی جسے وہ جاتے ہوئے ہمیں تحفے میں دے گیا۔ اب ہم نے اس تحفے کی جو حالت بنائی ہے؟ وہ سب کے سامنے ہے۔ چنانچہ پاکستان ہو یا ملایشیا، مصر و شام ہو یا الجزائر، تیونس ہو یا نائیجریا، جو مسلم خطے مغربی استحصالی

سامراج کے زیر تسلط رہے اور آزادی اور حریت کی تحریکوں کے باعث آخر کار سامراج کو انھیں چھوڑنا پڑا، وہ اسی نظام کو اپنے انداز میں اپنائے ہوئے ہیں۔ مقبوضات چھوڑنے کے بعد استعماری قوتوں نے مستقبل کے ایسے انتظام پر توجہ دی جس کے نتیجے میں ان تمام ممالک میں وہی سیاسی، قانونی اور تعلیمی نظام برقرار رہے، جو استحصالی سامراج نے مسلط کیا تھا۔ چنانچہ یہ نظام برقرار ہے۔ تیونس فرانسیسی زبان اور ثقافت کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ پاکستان، ملایشیا اور نائیجریا انگریزی میں اظہار خیال اور انگریز کی فکر، لباس اور غذا کو ترقی اور کمال سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ انگریز کی چھوڑی ہوئی قانونی، تعلیمی اور سیاسی روایت جوں کی توں، اپنی بوسیدگی اور خستگی کے باوجود برقرار ہے بلکہ روز بہ روز زیادہ مطلوب و مرغوب ہوتی جارہی ہے۔ اسی کو کامیابی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

سیاسی تناظر میں پارلیمانی جمہوریت ایوان بالا اور ایوان زیریں کی شکل میں جیسی برطانیہ میں پائی جاتی ہے، اس کا ایک ناقص چربہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے، حالاں کہ خود کئی یورپی ممالک (فرانس، جرمنی، اٹلی) برطانوی طرزِ جمہوریت کو پسند نہیں کرتے۔

مغربی جمہوریت کی بنیاد عوام کی حاکمیت اور منتخب کردہ نمایندوں کے ذریعے اپنے حق کے استعمال کے اصول پر کام کرنا ہے۔ جس میں قوت کا اصل سرچشمہ عوام قرار پاتے ہیں اور عوام کے منتخب نمایندے اس قوت کو تفویض کردہ اختیارات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ قانون سازی پارلیمنٹ کرتی ہے اور عدلیہ ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے انتظامیہ اور قانون ساز اداروں میں توازن برقرار رکھنے کا کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ قانون سازی کہاں تک دستور یا روایات سے مطابقت رکھتی ہے؟ اس کا فیصلہ اعلیٰ عدلیہ (عدالتِ عظمیٰ) کرتی ہے اور عدالت عظمیٰ کی تعبیر کو حتمی خیال کیا جاتا ہے۔ مغربی جمہوریت کے ان تین ستونوں، یعنی پارلیمنٹ، انتظامیہ، عدلیہ اور مسلح افواج کے کردار اور اختیار کو متعین کرنے کے بعد اسے اس کا پابند کر دیا گیا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان چاروں اداروں کو نفسیاتی الجھاؤ کی بنا پر گڈمڈ کر دیا ہے اور ساتھ ہی ہمارے اخلاقی زوال نے ان چاروں اداروں کو مسموم بھی کر دیا ہے۔ ہمارے سیاست دان اپنی پشت پناہی کے لیے عوام کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے طور پر سمجھتے ہیں کہ عوام ان کے زرخرید ہیں۔ دوسری جانب عسکری و بیرونی قوتوں سے ضرور اُمیدیں باندھ لیتے ہیں اور ان کے

منظورِ نظر ہونے پر پھولے نہیں سماتے۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات بھی موجود ہیں کہ جب بعض نام نہاد وزراے اعظم نے گریہ وزاری کے لہجے میں امریکی صدور سے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے حمایت کی درخواست کی۔ اسی طرح ایک آمر صرف ایک بیرونی کال پر ڈھیر ہو گیا۔

ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے مغربی جمہوریت کو جو مغرب کی فضا، ، ماحول، روایات، نظامِ حیات، تہذیبی اقدار اور اخلاق پر مبنی تھی، بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے یہ سمجھ کر اختیار کرلیا کہ جس صورت میں یہ وہاں رائج ہے، اسی شکل میں یہاں بھی مفید ہوگی۔ چنانچہ ایک فوجی آمر کے دور میں ایک فوجی افسر نے پاکستان کو یونین کونسلوں کے نظام کا تحفہ دیا جو برطانیہ میں کام کرتا ہے لیکن یہ نہ سوچا کہ وہ سیاسی تربیت، تقسیم اختیارات وقوت جو اس کی بنیاد ہے اس کے بغیر یہ کیسے کام کرے گا۔

مغربی جمہوریت کے خمیر میں جو اجزا شامل ہیں وہ ہماری روایات، نظام حیات اور اقدار سے ٹکراتے ہیں لیکن ہم نے جمہوریت کے بت کو سب سے متبرک سمجھتے ہوئے اس پر مختلف غازے چڑھا کر یہ سمجھ لیا کہ یہ ہمارے لیے مناسب ہوگی۔ چنانچہ مغربی جمہوریت کے لوازمات: لادینیت، سرمایہ دارانہ ذہنیت، مادہ پرستی، حق کی جگہ پارٹی پرستی، پارٹی پرستی کی جگہ شخصیت پرستی اور مفاد پرستی، مساوات مرد وزن کا نعرہ لگا کر معاشرتی عدم استحکام کو تقویت دی۔ غرض مغربی جمہوریت جس نظام کو قائم کرتی ہے وہ مسلمانوں کی ثقافت، عقیدے اور روایات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، لیکن ہم نے سادہ لوحی اور دین سے بغاوت کرتے ہوئے اسے ایک واجب تعظیم بُت کا مقام دے دیا۔ آج پاکستان کی وہ تین بڑی سیاسی جماعتیں جو ہر لمحے جمہوریت کا وظیفہ پڑھتی ہیں، اگر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو ان کا اندرونی نظام اور ملکی سیاست میں ان کا طرزِ عمل خلافِ جمہوریت کارناموں کی 'اعلیٰ ترین' مثال کہا جاسکتا ہے۔

مختصراً مغربی جمہوریت کے تحائف میں سرفہرست لادینیت، مغرب پر انحصار، ثقافتی مغلوبیت، انفرادی سطح پر خود پرستی، معاشرتی اقدار سے بغاوت، آزادی اور 'مذہب' کو مخصوص عبادت گاہوں میں محدود کردینے کی ثقافت ہیں۔ جہاں کہیں بھی اسے اختیار کیا گیا، وہاں اس نے معاشرتی عدم استحکام

اور سیاسی افراتفری پیدا کی، اخلاقی قدروں کو پامال کیا اور معاشی حوالے سے ایک طبقاتی، نظام وجود میں لانے کا باعث بنی۔ مسلم ممالک میں موجودہ سیاسی ، سماجی ، تعلیمی و معاشی بحرانوں کی طویل فہرست مغرب کی اندھا دھند تقلید ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ مسلم ممالک کے ذہنی اور فکری طور پر مغلوب اور غلام فرماں روا کبھی خود احتسابی کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

● **پاکستانی جمہوریت:** ہم نے جمہوریت کا جو ماڈل پاکستان میں نافذ کر رکھا ہے، اس کے لیے مناسب نام 'مفاد پرست جاگیرداریت' ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی میں موروثی سیاست سب سے نمایاں ہے۔ چنانچہ ناموں سے قطع نظر سیاسی جماعتوں پر (صرف جماعت اسلامی کو چھوڑتے ہوئے) نظر ڈالی جائے تو ہر جماعت اپنے لیڈر کی میراث پر فخر کرتے ہوئے اپنے مقام کو بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے سیاسی نعروں میں نہ کارکردگی کا تذکرہ آتا ہے، نہ مستقبل کا لائحہ عمل بلکہ 'مرحومین' اور قیادت کے منصب پر فائز تاحیات شخصیتوں کے نام کو اپنا امتیاز بتایا جاتا ہے۔ یہ جاگیردارانہ موروثی جمہوریت پاکستان کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

دوسرا بنیادی عارضہ یہ ہے کہ ہماری جمہوریت علاقائیت یا صوبائیت پر مبنی ہے۔ چنانچہ نام نہاد 'بڑی' جماعتیں اپنی صوبائی جڑوں پر فخر کرتی ہیں اور اپنے صوبے کو بطور اشتہار پیش کرتی ہیں کہ انھوں نے، جس صوبے پر وہ عرصے سے مسلط ہیں، وہاں یہ یہ کارنامے سرانجام دیے ہیں، اس لیے انھیں آیندہ بھی یہ موقع دیا جائے۔ فقط ایک صوبے تک محدود نظر ایک انتہائی خطرناک رجحان ہے جو ملک کی سالمیت اور دفاع کے لیے ایک خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو صرف جماعت اسلامی یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ اس کی پہچان کوئی صوبہ نہیں ہے، نہ اس کی قیادت صوبائی بنیاد پر ہے، نہ اس کی ممبرشپ کسی جاگیردارانہ وابستگی سے ہے، بلکہ وہ صرف اور صرف اپنے نظریے اور اسلام کی جامعیت و ہمہ گیریت کی بنیاد پر ہر صوبے میں اپنی دعوت کی بنیاد پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ داخلی سطح پر اس میں شورائیت اور بے لاگ احتساب کا نظام بھی قائم ہے۔

مروّجہ پاکستانی جمہوریت کی ایک اور خصوصیت سیاسی قیادت کا آمرانہ طرزِ عمل ہے۔ جن جماعتوں کو ہمارے ذرائع ابلاغ تین بڑی جماعتیں کہتے ہیں، ان کا قائد عملاً سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے، اس کا نام پارٹی پالیسی ہے۔ پارٹی کے اندر نہ صحیح جمہوری انتخابات کی

صورت ہے اور نہ فیصلوں میں مشاورت کا کوئی نظام ہے۔

قطع نظر جمہوریت کے حوالے سے نہ تو مغربی جمہوریت اور نہ مروجہ پاکستانی جمہوریت پاکستانی عوام کے مسائل حل کرسکتی ہے اور نہ ملکی سالمیت، استحکام اور ترقی کے لیے کارگر ہوسکتی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کا اضطراب اور جمہوریت پر اعتماد اٹھنے کا سبب ان دونوں طرز کے جمہوری نظاموں کا بنیادی نقص ہے۔ اگر اس کی اصلاح بروقت نہ کی گئی تو نوجوانوں کا اضطراب انھیں غیر جمہوری یا آمرانہ نظاموں کی طرف راغب کرسکتا ہے، جو ملکی سالمیت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوگا۔ نام نہاد جمہوریت میں پارٹی لیڈر کا آمر ہونا، یا فوجی آمر کا قابض ہوکر انھی سیاسی مہروں میں سے کچھ کو اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کرنا، یکساں طور پر ملک وملت کے لیے نقصان دہ ہے۔ ان دونوں ممکنہ راستوں سے ہٹ کر شاہراہِ کامیابی اگر کوئی ہے تو وہ صرف وہ نظام ہے، جس میں عدلِ اجتماعی، عوام کی عزت وتکریم اور قرآن وسنت کی بالادستی کو نافذ کیا گیا ہو۔

● **اسلامی نظام عدل:** پاکستان اور مسلم دنیا کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو ہر باشعور شخص اس نتیجے تک پہنچے گا کہ مغربی سامراجیت کا تحفہ لادینی سرمایہ دارانہ جمہوریت، جس میں مفاد پرست صنعت کار یا سرمایہ دار اور زمین دار موروثی طور پر سیاسی قیادت پر فائز ہوجائیں، پاکستان اور مسلم ممالک کے لیے زہر قاتل ہے۔ اور اسی طرح وہ نام نہاد جمہوریتیں جو مقامی علاقائیت اور لسانی قومیت کی بنیاد پر پیدا ہوئیں اور اقتدار پر قابض ہیں، عوام کو عدل وانصاف اور ملک کو استحکام اور ترقی دینے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اگر مسلم دنیا اور پاکستان کا کوئی مستقبل ہے تو وہ صرف ایسے عادلانہ نظام کے قیام میں ہے جس کی جڑیں اسلامی تصورِ حیات سے وابستہ ہوں۔

● **اسلامی نظامِ عدل کی پہچان:** مغربی لادین جمہوریت کی جگہ قائد تحریک اسلامی سیّد مودودی نے جو اصطلاح اپنی بات کی وضاحت کے لیے استعمال کی وہ Theo-Democracy ہے، جسے عرفِ عام میں اللہ کی حاکمیت پر مبنی عادلانہ جمہوری نظام کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظام اپنی ساخت اور خصوصیات میں مغربی لادین جمہوریت اور پاکستانی موروثی اور صوبائی جمہوریت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ۷۰ سال کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ اب نظام کی تبدیلی ہی مسائل کا حل ہے۔ نیا اسلامی فلاحی نظام آمرانہ بادشاہت اور مروجہ جمہوریت دونوں سے کوئی

مماثلت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے خدوخال ان دونوں سے ہر پہلو سے ممتاز ہیں۔

● **لِلّٰہیت:** اس نظام کی پہلی خصوصیت اس کی نظریاتی بنیاد ہے، جو للّٰہیت سے عبارت ہے، یعنی اللہ کو رب تسلیم کر کے اس کی دی ہوئی ہدایت کی روشنی میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر۔

للّٰہیت سے مراد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا انفرادی ، خاندانی ، معاشرتی، سیاسی، معاشی، قانونی، غرض زندگی کے تمام کاروبار میں فیصلہ کن مقام حاصل کرنا ہے۔ یہ کسی خانقاہ میں دنیا سے کٹ کر بیٹھنے کا نام نہیں بلکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے حکم کے نفاذ کا نام ہے۔ اسلامی عادلانہ نظام میں ہر فیصلے کی بنیاد للّٰہیت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کام کا کرنا۔ اسلام زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں دے دینے کا نام ہے۔ للّٰہیت سیاسی سرگرمی سے نہیں روکتی، بلکہ یہ اخلاقی صورت گری کا ذریعہ بنتی ہے، تاکہ سیاست کا مقصد ذاتی شہرت یا شخصیت کی مرکزیت نہ ہو، اس کی جگہ اللہ کی بندگی کو قرار دیا جائے۔ یہ ملک وملّت کی قیادت، خدمت، عدالت، انکسار، بے غرضی اور نمود و نمایش سے دوری کا نام ہے۔ یہ کسی مصنوعی لبادہ اوڑھنے سے پیدا نہیں ہوسکتی نہ کسی جبہ و دستار کی محتاج ہے۔ یہ انسان کے روزمرہ کے طرزِعمل میں پائی جاتی ہے۔ فخر واعزاز بادشاہت کا ہو یا کسی پہنچے ہوئے فقیر کا، دونوں للّٰہیت کی ضد ہیں۔ یہ صبر وقناعت اور استقامت کا نام ہے۔

● **شریعت کی بالادستی:** نئے نظام کی دوسری پہچان قرآن وسنت کی بالادستی اور فیصلہ کن ہونا ہے۔ اسلام کے عادلانہ نظام کا قیام صرف اس وقت ممکن ہے جب مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ ہو، یا ملکی معیشت وثقافت و تعلیم ہو یا ابلاغ عامہ، ہر شعبے میں، ہر سرگرمی کا انحصار قرآن وسنت کی ہدایات پر ہو۔ اسلامی شریعت کا اعجاز یہ ہے کہ الہامی ہونے کی بنا پر اس میں مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اسلامی شریعت وقت اور مقام کی قید سے آزاد مستقل حیثیت کی حامل ہے۔ مغرب زدہ افراد کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم رہی ہے کہ اسلامی شریعت جس کا نفاذ دورِ نبویؐ اور دورِ خلافت راشدہؓ میں ہوا، کس طرح اس دور میں نافذ ہوسکتی ہے۔ وہ انسان کے بنائے ہوئے زمان ومکان میں قید قوانین سے الہامی شریعت کا تقابل کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں

کہ وہ ایک بنیادی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ دو ایسے نظاموں کا تقابل کر رہے ہیں، جن کی بنیاد اور ساخت بالکل مختلف ہے۔ اسلامی شریعت الہامی ہے، اس لیے آفاقی ہے اور اس کے اصول ہر دور میں یکساں طور پر رہنمائی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جب کہ مغربی جمہوریت انسان کی خودساختہ ہے، اس لیے مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ یہ یکساں طور پر سب کی رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔

● **اسلامی ثقافتی اقدار**: اسلامی عادلانہ نظام کی تیسری پہچان اسلامی اخلاقی اقدار کی بنیاد پر فلاحی نظام کا قیام ہے۔ اسلامی نظام نہ صرف شریعت پر مبنی قانون دیتا ہے، بلکہ وہ انسانیت کی فلاح کی ضامن اخلاقی اقدار فراہم کرتا ہے، جن میں صدق، امانت و استقامت، حیا، جرأت، اعلاے کلمۃ الحق، معروف و منکر، حلال و حرام کی روشنی میں ترجیحات کا تعین کرتا ہے تاکہ زندگی کے نشیب و فراز میں اسلامی اقدار کی پابندی کی جاسکے۔

اسلامی اقدار توحید، عدل، صدق، امانت، حیا کا عکس اسلامی قوانین کی شکل میں نظر آتا ہے۔ جھوٹ اور بہتان کا سدِ باب قرآن و سنت کے دیے ہوئے مثبت اور تعمیری اخلاقی اصولوں کے ساتھ تادیب اور تعزیر کے نظام سے کیا گیا ہے۔ ہر قانونی اقدام سے پہلے مثبت اخلاقی اقدار کا وجود اور ہر خلاف ورزی کی شکل میں پہلے اصلاح، عفو و درگزر اور آخر کار تادیب و تعزیر انسانی معاشرے میں عدل و سکون کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ یہ بات قلم اور زبان تک محدود نہیں، اسلامی قانون کا تحقیقی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام سزا اور تعزیر سے زیادہ اپنی اخلاقی اقدار کے بل بوتے پر اور انسانی نفسیات کو اخلاق کا تابع کر کے ایک صحت مند ماحول اور معاشرہ پیدا کرتا ہے، جہاں اگر کسی سے غلطی کا ارتکاب ہو بھی جائے تو بجاے کسی کوتوال یا مخبر کے، انسان کا ضمیر نجات چاہتا ہے اور بغیر کسی گواہ کے، ملزم خود آکر اعترافِ گناہ کے ساتھ اپنے لیے سزا کی درخواست کرتا ہے۔ یہ اعزاز صرف اسلامی شریعت کو حاصل ہے کہ تجسس، مخبری اور جاسوسی کے بغیر اگر کسی سے غلطی ہو جاتی ہے تو اس کا ضمیر اسے اپنی اصلاح پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسلامی اقدارِ حیات کا اطلاق اسی وقت ممکن ہے جب نہ صرف مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ اس کی برتری اور حتمی ہونے کے قائل اور اس پر عامل ہوں، بلکہ تعلیم اور ابلاغ عامہ کے ذریعے اسلامی اقدار کو معاشرے کے ہر فرد

کے ذہن میں جاگزیں کر دیا جائے۔

● **تعلیم و ابلاغِ عامہ**: ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں، اس میں ریاست کے اعضا میں تعلیم اور ابلاغ عامہ کو وہی مقام حاصل ہو گیا ہے جو کل تک مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو حاصل تھا۔ آج ابلاغ عامہ کی فحاشی اور مخلوط محافل منعقد کروانے کی مہم اس مقام تک آ گئی ہے کہ اسلامی شعائر کو بھی مسخ کیا جا رہا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ: ''کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا'' کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ حال ہی میں ایک ایسی مخلوط نماز جنازہ کا برقی ابلاغِ عامہ پر پیش کرنا جو اخلاق، دین اور دینی حمیت کے منافی ہو، اشاعتِ منکر ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ اسلامی اخلاقیات نے زندگی کے تمام ہی مسائل اور معاملات کو جو اہم ہونے کے باوجود محدودیت اور احتیاط کا مطالبہ کرتے ہیں، انتہائی مہذب انداز میں بیان کیا ہے۔ طہارت اور جنسی تعلق جیسے موضوعات کو بغیر کسی منفی یا ہیجانی کیفیت کے تعلیم دینے کے انداز میں قرآن وسنت اور فقہ میں بیان کر دیا ہے۔ آج ابلاغ عامہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا یہ فطری اور عمومی طریقہ ہے اور آخر کار ایسے مناظر کی تکرار ان کو گوارا بنا دیتی ہے۔ یہ حکمت عملی اشتہارات میں، خبر ناموں میں، ڈراموں میں، گانوں میں، حتیٰ کہ تعلیمی مباحثوں اور مکالموں میں اس طرح رائج کر دی گئی ہے کہ نوجوانوں کو ان مناظر کا عادی بنا دیا جائے، اور اس طرح اسلام کے تصورِ حیات اور مرد و زن کے الگ الگ دائرۂ عمل کی جگہ مغربی تصورِ اختلاط مرد و زن کو معاشرے کا عموم اور رواج بنا دیا جائے۔

اسلامی نظام عدل کا قیام اسی وقت ہو سکے گا جب قوم کے ضمیر کو اسلامی اقدار کی پابندی پر تعلیمی حکمت عملی سے آمادہ کیا جائے۔ اسلام کوڑے کے مقابلے میں زبان و قلم اور عملی مثال سے تعلیم دینے کو فوقیت دیتا ہے، اور نیا نظام ان شاء اللہ اس معاشرتی برائی کو دستوری ذرائع سے ہی درست کرے گا اور کسی تعزیر کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تعلیم کو نہ صرف انگریز سامراج نے بلکہ اس کے جانشینوں نے اس ڈگر پر قائم رکھا جس پر انگریز نے اسے چلایا تھا۔ ۷۰ سالہ دور میں نہ تو معیارِ تعلیم کو بلند کیا گیا اور نہ تربیت کی طرف توجہ دی گئی۔ تعلیم دراصل تہذیبِ اخلاق کا نام ہے۔ حصولِ معلومات اس کا ایک پہلو ضرور ہے لیکن وہ تعلیم جو تہذیب و اخلاق سے خالی ہو، ایک بے روح

جسم اور دماغ تو پیدا کر سکتی ہے، ایک مکمل انسان وجود میں نہیں لا سکتی۔

اسلام کے عادلانہ نظام کی پہچان ایسے نظام تعلیم کا نفاذ ہے جو قومی ضروریات، فنی مہارت اور جدید ترین معلومات کے ساتھ تعمیرِ اخلاق کو اوّلیت دے۔ ملک میں امن وسکون اور رواداری اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب تعلیم اخلاق وتہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہو۔ تحریک اسلامی کو اس نئے نظام کے قیام کے لیے نئے نظام کے خدوخال کو بار بار پیش کرنا ہوگا، تاکہ صداقت اور حق پر گردوغبار اور غلط فہمیوں کی جو دبیز چادر ڈال دی گئی ہے، وہ دُور ہو، اور حق آجائے اور باطل معدوم ہوجائے کیوں کہ باطل معدوم ہونے کے لیے ہی ہے۔

● **تبدیلی کا طریقۂ کار:** اس عزم اور مستقبل کی روشن امید کے ساتھ جو سوال بار بار اٹھتا ہے وہ بھی توجہ طلب ہے، یعنی بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟ نظام کی تبدیلی کیسے ہوگی؟ تبدیلی انقلاب اور قوت کے استعمال سے آئے گی یا ایک طویل سیاسی جدوجہد کے بعد آئے گی؟

قرآن وسنت اور مکی اور مدنی ادوار کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حق وباطل کی کش مکش اور نظام کی تبدیلی کے لیے سب سے پہلے خود حق کے نظام پر مکمل اعتماد وایمان شرطِ اوّل ہے۔ قرآن کریم نے اسے واضح الفاظ میں بیان فرمادیا ہے کہ اللہ کے رسول جس چیز پر مکمل ایمان لائے اور جو اہل ایمان کی ہدایت کے لیے ان پر نازل کی گئی، یعنی کتاب وشریعت۔ دوسری بنیادی شرط اس ہدایت کا اپنی زندگی میں احسن شکل میں نافذ کرنا ہے۔ فرمایا گیا کہ: کیوں تم وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں'' (الصف ۶۱:۲-۳)۔ گویا تحریک اسلامی کی جانب سے ایسے افراد کی ایک جماعتِ کثیر کی تیاری جو اپنے علم وعمل کے لحاظ سے پختہ کار ہوں اور نظریے سے آگہی اور نظریے کے فروغ کے لیے اپنے کردار سے آگاہ ہوں، ایثار، قربانی و دیگر اسلامی خصائص سے مثالی طور پر مزین ہوں، جسے ہم آج کی زبان میں افرادِ کار کی تیاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کام محض جلسوں اور مظاہروں سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے پِتّا ماری کے ساتھ قرآن وسیرت سے براہِ راست تعلق، تفقہ فی الدین، اور تحریکی مزاج کا پیدا کرنا ہے۔ یہ خاصیت برسوں کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں صبر واستقامت کا ہونا شرط ہے۔

تبدیلی کے اس عمل کی ایک اور اہم شرط تعداد کی اہمیت کو کم کیے بغیر معیار کو فوقیت دینا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکن اپنی علمی، فکری، تنظیمی اور قائدانہ صلاحیتوں میں صفِ اوّل میں ہونے چاہییں۔ انھیں عصرحاضر کے علوم کے ساتھ قرآن وسنت کے علوم پر مکمل عبور ہو بلکہ مقامِ اجتہاد پر فائز ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جماعت اسلامی کے قیام کے وقت جو افراد کو جمع ہوئے تھے، ان میں ایک واضح تعداد ان افراد کی تھی جو علمی اور فکری طور پر سربراہی کے مقام پر فائز ہونے کے لائق تھے۔ آج بھی تبدیلی لانے کے لیے ایسے افراد تیار کرنا ہوں گے جو دینی اور عصری علوم، دونوں پر عبور رکھتے ہوں۔ یہ کام انفرادی طور پر نہیں بلکہ اداراتی بنیاد پر کرنا ہوگا، تاکہ ایسے ادارے موجود ہوں جو محض وقتی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر بطور ادارہ متحرک ہوں، اور مطلوبہ افرادی قوت کی تیاری و فراہمی میں کمی نہ ہو۔ تحریک کے افراد کی معیاری برتری ہی تحریک کی کامیابی کی شرط ہے۔

تبدیلیِ نظام کے لیے ایک اور شرط متبادل نقشۂ عمل اور لائحۂ عمل کی تیاری ہے۔ نہ صرف ایک خاکہ بلکہ اس میں تفصیلات کی شکل میں رنگ کا بھرنا۔ اگر تعلیمی نظام بدلنا ہے تو اس کا نیا نصاب کیا ہوگا؟ اس نصاب کی روشنی میں درسی کتب کون سی ہوں گی؟ ان کتب کو پڑھانے والا استاد کس کردار اور علمی رُتبے پر ہوگا؟ اسکول، کالج اور یونی ورسٹیوں میں کامیابی کا معیار کیا ہوگا؟ طلبہ اور اساتذہ میں کن اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی جائے گی؟ درسی کتب کے ساتھ جدید ابلاغ عامہ کو تعلیم کے لیے کیسے استعمال کیا جائے گا؟ کیا ملک کی ۱۸۵ موجودہ جامعات میں تبدیلی لانے کے لیے ایسے افرادِ کار تیار ہیں جو تعلیم، تجربہ اور صلاحیت میں اعلیٰ مقام پر ہوں؟ تعلیم، ملکی معاشی پالیسی، ملک کی دفاعی پالیسی، ملک کی صحت کی پالیسی پر جب تک تحریک کے پاس ایک واضح نظامِ عمل موجود نہ ہو، تو کیا محض پارلیمان میں کامیابی تبدیلی لاسکتی ہے؟

نظام میں تبدیلی کے لیے ایک اور شرط عالمی سیاست سے اتنی واقفیت بہم پہنچانا ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کی حکمت عملی اور ملک کے اندر اور باہر مختلف عناصر کی منصوبہ بندی سے مکمل آگاہی کے ساتھ ہمارے پاس ایک متبادل حکمت عملی بھی موجود ہے، جس میں حالات کے لحاظ سے تبدیلی لانے کی گنجایش ہو۔ جن عالمی قوتوں سے تحریک کا سامنا ہے، وہ کسی بھی صورت حال میں حق کو کامیاب نہیں دیکھنا چاہتیں۔ انھیں محض بددعائیں دے کر ناکام نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی

سازشوں کا علم بھی کافی نہیں ہے۔ جب تک ہماری اپنی حکمت عملی ان سے بہتر اور برتر نہ ہو، کامیابی ممکن نہیں، اور نہ کوئی تبدیلی دیرپا ہوسکتی ہے۔

ان شرائط پر غور کیا جائے تو ان پر عمل صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب دستوری ذرائع، تعلیمی ذرائع اور تربیتی ذرائع استعمال کیے جائیں۔ یہ کام کسی قوت یا طاقت کے ذریعے محض اعلیٰ سطح پر تبدیلی لانے سے نہیں ہوسکتا۔ اسلام جس نظامِ عدل کا قیام چاہتا ہے وہ فرد، معاشرہ، تعلیم، قانون، معیشت اور سیاست میں ہمہ گیر تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ صبر و استقامت سے کرنے کا کام ہے۔ اس کے لیے تحریک کے نظامِ تربیت کا انتہائی مؤثر ہونا شرط اوّل ہے، تاکہ کارکن سے قیادت تک للّٰہیت، فہم دین، تفقہ، عصری علوم پر عبور، قرآن وسنت سے انتہائی قریبی تعلق، معاملات میں شفافیت، سادگی، انکسار، ایثار و قربانی کی صفات کارکنوں کی شخصیت کا حصّہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور سچا وعدہ ہے۔ جو لوگ اللہ کو رب مان لیں گے اور اہل ایمان کی صفات سے مزین ہوں گے تو ان کی کامیابی کی ضمانت دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر رب کریم نے خود دی ہے۔ اس کا یہ وعدہ جیسا ماضی میں حق تھا، آج بھی حق ہے۔ فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۱۳۹ (اٰلِ عمرٰن ۳:۱۳۹) دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔